عصرِ حاضر کا جلیل القدر مفکّر

خواجہ عبدالوحید صاحب
ایڈیٹر "الاسلام" کراچی

مغرب کی زبان سے "انقلاب" کا لفظ سننے والے مغربیت پسند ہندو پاکستان کے نوجوانوں کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ آج سے تقریباً اڑھائی سو برس پیشتر برصغیر ہندو پاکستان کی سرزمین پر مغلیہ سلطنت کے مرکز (دہلی) میں اسلام کے ایک جلیل القدر مفکر نے انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ یہ انقلاب اس لئے نہیں تھا کہ قانون کی حد بندیوں کو توڑ کر اخلاقی انارکی پھیلا دی جائے۔ نہ اس انقلاب کا مقصد یہ تھا کہ افراد کو دنیا میں من مانی کارروائیاں کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ اس انقلاب کی غرض یہ تھی کہ نوع انسانی کی سیاسی، معاشی اور عمرانی مصیبتوں کا یک قلم خاتمہ کر دیا جائے۔

ہندو پاکستان کے عام باشندے اس زمانہ میں اس جلیل القدر مفکر کے افکار عالیہ کو نہ سمجھ سکے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ تاریخ عالم میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ خدا کا ایک بندہ گرے ہوؤں کو اٹھانے اور مرے ہوؤں کو دستور حیات پیش کرتا ہے، لیکن گرے ہوئے اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور موت کے منھ میں جانے والے اس کے نعرۂ حیات کو نہیں سنتے۔ لیکن اس کے باوجود نیک خیالی اور نیک عملی کا جو بیج خدا کا وہ بندہ نامساعد حالات اور ناموافق ماحول میں بو جاتا ہے، وہ بالآخر برگ و بار پیدا کر کے رہتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے ساتھ بھی پیش آیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ ۱۷۰۳ء میں سلطنت مغلیہ کے سیاسی مرکز "دہلی" میں پیدا ہوئے، ایسے ماحول میں جہاں ملوکیت اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ چھا رہی تھی۔ تعلیم و تربیت کے ساتھ کارفرمائے غیب سے

شاہ صاحبؒ کو وہ علمی اور عملی استعداد بھی عطا ہوئی تھی کہ انہوں نے دنیائے افکار کے ہر شعبہ میں انقلاب عظیم برپا کردیا۔ سمجھنے والے اگرچہ اس وقت تھوڑے تھے، لیکن ان مٹھی بھر مخلصین کی جماعت نے جس خلوص اور تندہی کے ساتھ کام کیا، اس کا نتیجہ آگے چل کر بہت شاندار صورت میں نمودار ہوا۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے علوم وفنون مختلفہ کا جو عظیم الشان ذخیرہ کثیر المقدار تصانیف کی صورت میں چھوڑا ہے آج اگر کوئی قوم اس کو اپنا سرمایۂ حیات بنالے تو خدا سے بغاوت کے بغیر وہ دنیا کی ہر اس لعنت سے نجات پاسکتی ہے، جس سے نجات کا دعویٰ مغربیت، اشتراکیت اور دوسرے تمام لادینی مکتبۂ فکر کرتے ہیں۔ آج کے پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کی بدبختی ہے کہ وہ عربی اور فارسی عام طور پر نہیں جانتے، اور یہی وہ زبانیں ہیں، جن میں شاہ صاحب نے اپنے افکار عالیہ کو قلم بند فرمایا ہے۔ اس لئے مسلمانان ہند و پاکستان کو ان حضرات کا ممنون ہونا چاہیئے، جنہوں نے شاہ صاحب کے خیالات کو اردو اور دیگر ملکی زبانوں میں پیش کرنے کا عہد کرلیا ہے۔ اس موقع پر ہم اس جلیل القدر خاتون کو خراج عقیدت پیش کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے، جس کی اولوالعزمی اور فیاضی نے حضرت شاہ صاحب کے فلسفہ اسلامی کی نشر واشاعت کی ایک مستقل صورت پیدا کردی ہے۔ مسلمانان ہند و پاکستان پر یہ بہت بڑا احسان ہے، جس سے عہدہ برآ نہیں ہوا جاسکتا تصور میں بھی نہ آتا تھا کہ اس دور جہل وعہد فتن میں کوئی عورت آگے بڑھے گی اور درجۂ "السابقون الاولون" حاصل کرے گی! لیکن اب یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سب سے اول یہ امر ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا روئے سخن تمام عالم انسانیت کی طرف ہے انہوں نے جس قدر قواعد کلیہ بیان کئے ہیں، وہ عمومی حیثیت رکھتے ہیں اور تمام اقوام عالم کے لئے قابل قبول وعمل ہیں۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چونکہ ان کے اولین مخاطب قرآن کے ماننے والے ہیں، اس لئے انہوں نے مسائل کی مثالیں شریعت اسلامی سے دی ہیں یہ تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ اگر قرآن کو ماننے والی قوم کے صاحب فکر وعمل حصے کو دنیا کے سامنے عملی نمونہ بناکر پیش کردیا

جائے تو پھر اس کے ذریعہ آگے چل کر دیگر باشندگان ملک اور اس کے بعد عالم انسانی میں ایک عمومی انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب کے فکر میں اساسی حیثیت قرآن کریم کو حاصل ہے، وہ اسے انسانی زندگی کا مکمل ضابطۂ حیات قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نزول قرآن کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہنگامہ ہائے درس و تدریس میں گرمی پیدا کی جائے، بلکہ قرآن اس لئے آیا تھا کہ انسانوں کے لئے اس زندگی کی مصیبتوں اور موت کے بعد کی زندگی کی صعوبتوں کو ان کے راستے سے ہٹا دے۔ ان کے نزدیک قرآن کا اصلی اعجاز اس کے متعین کئے ہوئے نظام حیات ہی میں ہے۔ اس لئے کہ اس نظام حیات میں ہر شخص کے لئے خواہ وہ شرقی یا مغربی، سیاہ ہو یا سفید، امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل، پیغام فلاح و کامرانی موجود ہے۔

اسلام میں قرآن حکیم کی اساسی حیثیت واضح کرنے میں شاہ صاحبؒ نے بہت ہی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ علمائے فقہ نے دین کے جو چار اصول قائم کئے ہیں یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ ان میں سے شاہ صاحب قیاس کو کوئی مستقل حیثیت نہیں دیتے۔ اجماع کا دارومدار ان کے نزدیک کتاب و سنت پر ہے اور سنت خود قرآن سے مستنبط ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دین کی اصل قرآن میں ہے اس حقیقت کے پیش نظر شاہ صاحب نے قرآن حکیم کے متن کو واضح کرنا سب سے زیادہ ضروری سمجھا وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے برصغیر ہند و پاکستان میں قرآن کا کسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ فارسی زبان میں تھا اس لئے کہ اس زمانہ میں اس ملک میں فارسی زبان عام طور پر سمجھی، بولی اور لکھی جاتی تھی۔ اس ترجمہ قرآن میں شاہ صاحب کے کمالات علمیہ کا بہترین مظاہرہ ہوا ہے، اس لئے کہ اس تحت اللفظ ترجمے کے پڑھ لینے سے قرآن حکیم کے مطالب سمجھ لینا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ اور پڑھنے والا دوسری بڑی بڑی تفاسیر کا محتاج نہیں رہتا۔

شاہ صاحب نے حکمت قرآنی کو ایک موثر اور مربوط صورت میں بیان فرما کر قرآن حکیم کی شاندار خدمت انجام دی ہے انہوں نے ان تمام انبیاء کی تعلیم میں جن کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے فکری وحدت دکھائی ہے اور انسانی فکر کو اول سے آخر تک ایک تاریخی تسلسل میں مرتب کر دیا ہے۔ بقول مولانا عبیداللہ سندھیؒ ہے۔

"انسانی فکر کی تدریجی ترقی کا تعین اور پھر قرآن سے اس کی مطابقت کرنا، یہ خصوصیت ہے شاہ ولی اللہ صاحب کے کمال علم کی، جو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا اگر شاہ صاحب کی اس حکمت کو بخوبی سمجھ لیا جائے تو قرآن کا متن واضح ہو جاتا ہے۔"

شاہ صاحبؒ کی خدماتِ قرآن کا سلسلہ بہت وسیع ہے، انہوں نے بے شمار ایسے مسائل صاف کئے ہیں، جن کے متعلق صدیوں سے غلط فہمیاں چلی آرہی تھیں۔ مثلاً قرآنی آیات کے شان نزول کے متعلق انہوں نے یہ وضاحت کی کہ اگرچہ مختلف آیات خاص خاص مواقع پر خاص خاص حالات اور اشخاص کے متعلق نازل ہوئیں، تاہم قرآنی مطالب کی تشریح میں ان کی عمومیت مدنظر رہے گی۔ اس لئے کہ اگر قرآنی آیات کو جزئی واقعات سے مختص کر دیا جائے تو آج کل کی زندگی میں قرآن بحیثیت مجموعی موثر نہیں ہو سکتا حالانکہ قرآن تا قیام قیامت نوع انسانی کی عملی رہنمائی کے لئے نازل ہوا ہے۔

حکمت قرآن کی وضاحت کے سلسلے میں شاہ صاحب نے جو مجتہدانہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کے سلسلے میں مسئلہ نسخ کا ذکر مفید ہوگا۔ عام مفسرین نے قرآن حکیم کی سینکڑوں آیات کو منسوخ قرار دیا ہے۔ علامہ جلال الدین السیوطی نے اپنی مشہور کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں ان تمام آیتوں کو گو غیر منسوخ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بیس آیات ایسی ہیں جنہیں وہ غیر منسوخ ثابت نہیں کر سکے۔ شاہ ولی اللہ نے ان بیس آیتوں میں سے پندرہ آیتوں کی ایسی تطبیق فرمادی کہ ان کا منسوخ ہونا غیر ضروری ہو گیا اب صرف پانچ آیتیں ایسی رہ جاتی ہیں، جن کا غیر منسوخ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ حکمت ولی اللہی کی روشنی میں وہ پانچ آیتیں بھی غیر منسوخ قرار دی جا سکتی ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ اس بات کے مدعی ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان پانچ آیتوں میں سے مثال کے طور پر وہ اس آیت کو لیتے ہیں، جو سب سے زیادہ مشکل سمجھی گئی ہے۔ یعنی آیت وصیت، اس آیت کو اس لئے منسوخ قرار دیا جاتا ہے کہ اس آیت کے بعد آیات وراثت نازل ہو گئیں اور چونکہ ان میں ورثا کے حصے متعین کر دیئے گئے۔ اس لئے اب ان کے حق میں وصیت کی ضرورت نہ رہی مولانا عبیداللہ صاحب کے نزدیک بعض حالات میں اب بھی آیت وصیت پر عمل ہو سکتا ہے، مثلاً اگر ایک مسلمان کے والدین کافر ہوں تو بوجہ اپنے کفر کے وہ اس کی وراثت میں شریک نہیں ہو سکتے

ایسی صورت میں اگر وہ مسلمان اپنے والدین کے حق میں وصیت کردے تو وصیت والی آیت قابل عمل بن جاتی ہے اور اسے منسوخ قرار دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

قرآن کے بعد علوم اسلامیہ میں حدیث کا درجہ آتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے کے لئے ایک مفصل نظام یا دستور العمل مرتب فرمایا تھا۔ اس نظام کو "سنت" کا نام دیا گیا ہے۔ علمائے حدیث نے دو سو برس کی متواتر محنت سے سنت کے اس مواد کو احادیث کی کتابوں میں جمع کر دیا ہے ان کتابوں میں بعض کتابیں ایسی ہیں، جن میں اہتمام کے ساتھ "صحیح" روایات جمع ہیں اگرچہ ایسی روایتوں کے متعلق ساتھ ساتھ تصریح کر دی گئی ہے کہ وہ صحیح نہیں) اس طرح شاہ صاحب کے نزدیک کتب حدیث میں اور بھی کئی طرح کے فرق ہیں۔ ان تمام فروق کو مدنظر رکھ کر شاہ صاحب نے تمام کتب حدیث کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔ طبقۂ اوّل میں وہ موطا امام مالک صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو شمار کرتے ہیں اور طبقۂ دوم میں سنن ابوداؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی کو۔ ان چھ کتابوں کی روایات کو شاہ صاحب حجت تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ دوسرے طبقات کی کتب حدیث میں جو روایات ہیں، شاہ صاحب کے نزدیک وہ حجت نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک قابل توجہ امر یہ ہے کہ اوّل تو شاہ صاحبؒ موطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شمار کرتے ہیں اور پھر ان میں سے اصح الکتب مؤطا کو تسلیم کرتے ہیں۔ موطا کی اہمیت کے پیش نظر شاہ صاحب نے اس کی ایک شرح عربی زبان میں "المسوّیٰ" کے نام سے لکھی اور فارسی زبان میں "المصفّیٰ" کے نام سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے خیال میں شاہ ولی اللہ کا موطا کو حدیث کی تمام کتابوں پر فائق اور مقدم قرار دینا طریقہ ولی اللہیؒ کا اساسی جوہر ہے۔

حدیث کے بعد علوم اسلامیہ میں فقہ کا درجہ ہے۔ اور حسب معمول فقہ میں بھی شاہ ولی اللہ صاحب کا مقام بہت بلند نظر آتا ہے۔ اصول فقہ کے بیان کرنے میں شاہ صاحب نے بے شمار نکات ایسے بیان فرمائے ہیں، جنہیں سمجھ لینے کے بعد دنیا کے دوسرے قوانین کے مقابلے میں فقہ اسلامی کی برتری واضح ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک نمایاں خدمت شاہ صاحب نے یہ انجام دی ہے کہ انہوں نے ائمہ

مجتہدین کے ظاہری اختلافات کے باوجود، اصلاً ان کے اجتہادات کو یکساں ثابت کردیا ہے۔ اس طرح فلسفہ میں شاہ صاحبؒ کی مجتہدانہ تصریحات کی روشنی میں آریائی تخیل اور سامی حکمت کا ظاہری اختلاف رفع ہو جاتا ہے۔

تصوف میں بھی شاہ صاحب نے مسئلہ وحدت الوجود کی جو تفصیل و تصریح فرمائی ہے اس سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ آریائی ذہنیت اسلامی فکر کو قبول کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ تصوف کے سلسلے میں شاہ صاحبؒ کی ایک اور نمایاں خدمت قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ غلط کار صوفیوں اور تنگ نظر اور ظاہر بیں مولویوں نے طریقت اور شریعت کے درمیان حجابات کی جو دیوار قائم کردی تھی، شاہ صاحب نے اسے گرادیا۔ آپ نے یہ ثابت کردیا کہ اگر شریعت انسان کے ظاہری پہلو کی صفائی کا اہتمام کرتی ہے تو طریقت اس کے باطنی پہلو کا تزکیہ کرتی ہے اور اس لئے مجموعی انسانی ترقی کے لئے دونوں ناگزیر ہیں۔ ظاہری طہارت کے بغیر قلب کی پاکیزگی پیدا نہیں ہوسکتی اور قلب کی صفائی کے بغیر ظاہری پاکیزگی بیکار ہوکر رہ جاتی ہے اس طرز خیال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت اور طریقت میں اصلاً کوئی تضاد نہیں۔

غرضکہ شاہ ولی اللہ دہلوی بیک وقت قرآن کے مفسر بھی ہیں اور حدیث کے ماہر بھی، وہ فقہ میں اجتہاد کا مرتبہ بھی رکھتے ہیں اور ایک باکمال صوفی بھی ہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس طرح کی جامع کمالات شخصیتیں دنیائے اسلام میں صدیوں کے بعد ہی پیدا ہوتی ہیں۔

اب ہم شاہ صاحب کے فکر کے ایک اور اہم حصے کی طرف متوجہ ہونا چاہتے ہیں، شاہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ جب تک انسان کا مادی ماحول درست نہ ہو اس وقت تک وہ اپنی اعلیٰ تر روحانی استعدادوں کی ترقی و تہذیب کی طرف توجہ نہیں کرسکتا اس لئے سوسائٹی کا نظام، حکومت کا دستور اور معاشی تنظیم ان سب چیزوں میں جب تک انقلاب عظیم برپا نہ ہو نسل انسانی کی روحانی ترقی کے لئے سازگار ماحول تیار نہ ہوگا۔ اس بنا پر شاہ صاحب کا پیغام "انقلاب" کا پیغام ہے۔ وہ جابر حکمرانوں، ظالم سرمایہ داروں اور سیاسی خودغرضوں کو بیک وقت مٹاکر ایک صالح نظام کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی بتادیتے

ہیں کہ اس قسم کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اس کی بنیاد اخلاق پر نہ رکھی جائے شاہ صاحب انسانی کامیابی کا دارومدار چار بنیادی اخلاق قرار دیتے ہیں۔

۱۔ طہارت

۲۔ خضوع وخشوع

۳۔ ضبط نفس

۴۔ عدالت

ان میں سے آخری چیز یعنی عدالت پر تفصیلی بحث کے دوران شاہ صاحبؒ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ کسی سوسائٹی میں عدل وانصاف پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احتراز کلی نہ برتا جائے۔ ان کے نزدیک چونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں قیصر وکسریٰ کی غیر صالح حکومتوں نے متمدن دنیا کے بیشتر حصے کو اقتصادی بدحالی میں مبتلا کر رکھا تھا، جس کا نتیجہ عام بداخلاقی کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اس لئے نزول قرآن کا ایک بہت بڑا مقصد یہی تھا کہ قیصر وکسریٰ کا نظام سلطنت توڑ کر ایک صالح نظام قائم کر دیا جائے جو اقوام عالم کو ہر طرح کی مصیبتوں سے نجات دلا دے۔

شاہ صاحب نے ایک طرف تو اپنے فکر کو عربی اور فارسی تصانیف میں تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا اور دوسری طرف اس فکر کو معرض عمل میں لانے کے لئے ایک جماعت بھی مرتب فرمائی جسے مولانا سندھیؒ "حزب ولی اللہ" کا نام دیتے ہیں۔ اس جماعت کے حالات بیان کرنے کے لئے مولانا نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" مرتب فرمائی اس کتاب میں مولانا نے "حزب ولی اللہ" کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ ترتیب دیا ہے۔

مولانا ہمیں بتاتے ہیں کہ شاہ صاحب نے مئی ۱۷۳۱ء میں حکومت دہلی کے مفاسد کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ ہمارے انقلاب پسند نوجوانوں کو

تعجب ہوگا کہ یہ واقعہ انقلاب فرانس سے اٹھاون سال پیشتر ہوا تھا۔ شاہ صاحب نے ایک جمعیت مرکزیہ قائم کی، اس کا ایک نصب العین متعین کیا، اس کے لئے ایک مفصل لائحہ عمل مرتب کیا اور پھر اس جمعیت کی شاخیں تمام ملک میں پھیلا دیں۔ شاہ صاحب کے علمی و عملی مرتبہ کا اثر یہ ہوا کہ اس تحریک میں علماء و صوفیا، امراء اور عہدہ داران سلطنت، ہر طرح کے لوگ شریک ہو گئے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ کے دو سال بعد ۱۷۶۳ء میں وفات پائی۔

اس سلسلے کی ایک دلچسپ بات وہ ہے، جسے براہ راست اس فقیر نے مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم سے سنی تھی اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جب جا رہے تھے تو کپتان جہاز نے جو غالباً کوئی اٹالین تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا، یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ حجاج میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے انہوں نے کپتان سے مولانا کے حالات بیان کئے اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہاں کیا تھا مولانا بخوشی کپتان سے ملے کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کر سکتا ہوں۔ مولانا نے اسے بھی منظور فرما لیا۔ وہی انگریزی خواں صاحب ترجمان بنے۔ کپتان پوچھتا تھا، اور مولانا جواب دیتے تھے تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کو سنکر وہ کچھ مبہوت سا ہو گیا۔ اور مولانا کے ساتھ اس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کر دے۔ اس نے شاید وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندوستان حضرت سے ملنے کے لئے حاضر ہوگا اس واقعہ کا مولانا محمد قاسمؒ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرما لیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا۔

(مولانا سید مناظر احسن گیلانی ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت)